© rasailojaraid.com

ڈاکٹر انور اقبال قریشی

خلیفہ مرحوم کی زندگی کا یادگار دور

خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات عثمانیہ یونیورسٹی کے کلب میں ۲۶ جون ۱۹۳۰ء کی شام کو ہوئی۔ موسم گرما کی تعطیلات کے بعد یونیورسٹی کے کھلنے کا یہ پہلا دن تھا اور یونیورسٹی میں میری ملازمت کا بھی روز اول تھا۔ میرا تقرر بطور صدر شعبۂ معاشیات عمل میں آیا تھا اور میں اسی روز سیدھا جالندھر سے حیدرآباد پہنچا تھا۔ لیکن میری "شہرت" میرے آنے سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری آمد کے خلاف جامعہ میں اچھا خاصا محاذ قائم کر دیا گیا تھا۔ ایک تو اس زمانہ میں ملکی اور غیر ملکی کا مسئلہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ کسی غیر ملکی کا تقرر یوں ہی ممکن نہ تھا اور میری یہ بھی بدقسمتی تھی کہ خود جامعہ کے اندر چند نہایت با اثر اساتذہ کے حقوق میرے تقرر سے متاثر ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو دربار تک رسائی حاصل تھی لہذا انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ میرا تقرر عمل میں نہ آئے۔ ملکی تحریک کی شدت کے باوجود خود ملکی حلقوں میں اس بات کا احساس تھا کہ جامعہ میں بہترین استادوں کا تقرر ہونا چاہیئے۔ اس وقت حکومت کی باگ ڈور سر اکبر حیدری کے ہاتھوں میں تھی اور انہی کے ایما پر باوجود سخت مخالفت کے میرا تقرر عمل میں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی کے حلقوں میں میری آمد سے پہلے میرا خاصہ چرچا ہو چکا تھا۔ جس سے خلیفہ صاحب بخوبی واقف تھے۔

اسی شام جب یونیورسٹی کلب میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے دیکھتے ہی خود بخود ہنس کر کہنے لگے میاں تم سے تو مل کر مجھے کچھ مسرت نہیں ہوئی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ جو شخص لندن یونیورسٹی میں لکچرار رہا ہو اور ریزرو بنک کی جس نے افسری کی ہو وہ کوئی بہتر قسم کا آدمی ہوگا لیکن تم تو مجھے بالکل طفل مکتب نظر آتے ہو۔ کلب کی مجلس بھری ہوئی تھی سب لوگوں کی نظریں دفعتًہ میری طرف اٹھ گئیں اور میں کچھ جھینپ سا گیا اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔

خلیفہ صاحب بہت بامذاق آدمی تھے لیکن ان کی ہر دلعزیزی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے مذاق میں طنز تو ضرور ہوتا تھا لیکن طعن کبھی نہ ہوتا۔ بات جب کرتے تھے تو چہرہ پہ ہمیشہ دل کش مسکراہٹ ہوتی تھی جس میں محبت اور خلوص کا پہلو نمایاں ہوتا۔ یہی پہلا مذاق باقی عمر بھر کی دوستی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ میرے دل نے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ سارے کلب میں یہ واحد شخص ہے جو میرے تقرر سے دلی طور سے خوش ہے اور اس بات پر مفتخر ہے کہ اس کے وطن کے ایک مسلمان نوجوان کو زندگی کے اوّلیں منازل ہی میں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلیفہ صاحب سے اگرچہ یہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ وہ جامعہ کے مشہور پروفیسر تھے اور ان کی علمی شہرت حیدرآباد سے باہر پھیل چکی تھی۔ میرے ذہن میں ان کا ابتدائی تصور ایک عجیب قسم کے دبلے پتلے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر پروفیسر کا تھا اور یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ عبدالحکیم صاحب ایک خوش رو، خوش وضع، سرخ و سپید تومند اور جامہ زیب اور نہایت خوش مزاج و مخلص انسان ہوں گے۔ عمر کے فرق کے باوجود اسی شام سے ان سے دوستی قائم ہوگئی اور دن بدن بڑھتی گئی، اور حالات کچھ ایسے سازگار ہوئے کہ ہمارے پورے خاندان دوستی کے اس رشتہ میں منسلک ہوگئے۔ میری اکلوتی بچی بشریٰ ان کی بچی رفیعہ کی ہم جماعت تھی اور وہ دونوں بالکل بہنیں بن گئیں اور جب میری بیوی کی ملاقات بیگم خلیفہ سے ہوئی تو ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ہم سے بھی بڑھ گیا اور بفضل تعالےٰ اب تک جاری ہے۔

عام پڑھنے والوں کو ان خانگی تعلقات سے چنداں دلچسپی نہ ہوگی اور میں ان کا ذکر بھی نہ کرتا لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر اس ماحول کا ذکر نہ کیا جاتا تو آیندہ بعض تفصیلات کی جن کا ذکر آئے گا پوری طرح وضاحت نہیں ہوسکتی تھی۔ خلیفہ صاحب کے دوست احباب واقعی لاتعداد ہیں۔ وہ اس قدر مرنجاں مرنج آدمی تھے کہ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل لیتا ہمیشہ ان کا دم بھرتا۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد جو ان کی زندگی کے ہر پہلو سے آگاہ ہوں اور جنہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ گزارا ہو زیادہ نہیں ہے۔

جون ۱۹۳۷ء سے لے کر ستمبر ۱۹۴۶ء تک، جب تک کہ میں حیدرآباد میں رہا شاید ہی کوئی صبح یا شام ایسی گزری ہو جب خلیفہ صاحب سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ ہمارے گھر ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے خلیفہ صاحب کا اپنا ذاتی بنگلہ بہت شاندار تھا۔ اس وقت حیدرآباد میں جرمن ڈیزائن بنگلوں کا رواج تھا جو بہت مقبول تھے۔ لیکن میرے خیال میں یہ گھر گرم ممالک کے رہنے والوں کے لیے چنداں موزوں نہ تھے۔ خلیفہ صاحب کا مکان مجھے اس لیے پسند آیا کہ یہ مغلوں کی عمارتوں کے طرز پر بنایا گیا تھا جس میں کھلے کھلے برآمدے اور خوبصورت محراب اور ستون تھے۔ اس گھر میں آٹھ ہزار گز زمین تھی اور پانی کی کثرت سے ملنے کی وجہ سے ان کا خانہ باغ بہت شاداب تھا۔ یونیورسٹی ہمارے گھر سے دور تھی۔ ان دنوں چار میل کا فاصلہ بھی بہت دور سمجھا جاتا تھا، لہٰذا ہم دونوں باری باری ایک موٹر میں جاتے تھے اور دوسری موٹر بچوں کو اسکول لے جانے یا بیگمات کے لیے مخصوص رہتی۔ اکثر و بیشتر اہم چیزوں میں ہم دونوں کی طبیعتوں کا میلان یکساں تھا خلیفہ صاحب دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کے ہی نہیں بلکہ سونے کے عادی تھے۔ میری یہ انتہائی کمزوری کہیئے یا راسخ عادت کہ اگر دوپہر کی نیند نہ ملے تو میں پھر کام ہی نہیں کرسکتا۔ انگلستان جیسے سرد ملک میں بھی طالب علمی کے زمانے اور سردی کے موسم میں بھی دوپہر کا سونا نہ چھوٹا۔ چنانچہ یونیورسٹی میں جب کبھی تیسرے پہر میں کوئی میٹنگ کرنے کا سوال پیدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو میری اور خلیفہ صاحب کی رائے ہمیشہ اس کے خلاف ہوتی اندریں کامیابی اس لیے ہو جاتی کہ ہم صاف کہہ دیتے کہ اس صحبت میں باہم شرکت سے معذور ہیں۔ جب خلیفہ صاحب کو شروع شروع میں میری اس عادت کا پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے میاں بس، اب ہماری دوستی پکی ہو گی۔ تم بہت سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جو شخص دوپہر میں آرام نہیں کرتا وہ اپنی زندگی سے دشمنی کرتا ہے۔

شام کو ہم دونوں مغرب کے قریب اکھٹے یونیورسٹی کلب جایا کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب پیدل چلنے کے چنداں شوقین نہ تھے۔ اگرچہ تھوڑا سا ٹہلنا ضرور پسند کرتے تھے۔ میں بھی اس معاملے میں سخت چور واقع ہوا ہوں۔ کلب ہمارے گھر سے تقریباً ڈیڑھ میل تھا۔ چنانچہ دستور یہ تھا کہ اکثر کلب پیدل جاتے اور واپسی کے لئے موٹر منگوا لیتے۔ موٹروں میں جانے اور آنے کا تو اکثر اتفاق ہوتا تھا لیکن دونوں طرف پیدل چلنے کا موقع کبھی نہ آیا۔

خلیفہ صاحب کا گھر بچوں اور بیگمات کے لیے کلب کا کام دیتا تھا اور وہاں کم و بیش ہر روز ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کلب اپنی نوعیت کا ایک ہی کلب تھا جس کا بدل آج تک کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حیدر آباد چھوڑنے کے بعد یہی افسوس رہا کہ اور تو سب چیزوں کی تلافی ہو گئی لیکن یونیورسٹی کلب کا نعم البدل نہیں ملا۔ اور نہ ملنے کی توقع ہے۔ اس کلب کی سب سے نادر خوبی گپ تھی۔ گپ اور محض خالص گپ۔ لیکن اس گپ کا معیار بہت اونچا ہوتا تھا۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ بازی کے علاوہ حالاتِ حاضرہ پر بہت دلچسپ تبصرہ ہوتا تھا۔ تمام جنگ کے دوران میں حالاتِ جنگ پر جو سیر حاصل تبصرہ اس کلب میں ہوتا وہ دنیا کے اچھے سے اچھے اخبار میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ بعض زندہ دل اراکین اس کے لیے خاص طور پر تیار ہو کر آتے تھے اور دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے الگ الگ خبریں اور تبصرے سنتے تھے اور پھر کلب میں اس پر تنقید ہوتی تھی۔ میں اور خلیفہ صاحب دو ایسے اراکین تھے جو اپنے گھروں میں ریڈیو بہت کم سنتے تھے۔ اور زیادہ تر کلب کے تبصرے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ہر شام کلب میں مستقل آنے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ جو لوگ محض ٹینس کھیلنے کے لیے آتے تھے وہ جلدی آتے اور جلدی چلے جاتے۔ اصل مجلس مغرب کے بعد جمتی اور شب تک ختم ہو جاتی۔ اس کلب کی ایک خاص چیز "ایک رکابی ڈنر" تھا۔ میں نے سنا ہے کہ اس کی نقل اور جگہ بھی گئی لیکن وہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ ڈنر والی رات تقریباً بیس اصحاب ہوتے تھے اور اس میں زیادہ تر وہی لوگ شریک ہوتے جو باقاعدہ کلب آتے تھے۔ ویسے تو کلب کے جملہ اراکین کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ یہ ڈنر بالکل غیر رسمی ہوتا تھا اور اراکین کو اس کی اطلاع دینے کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ کھانے پینے کے لحاظ سے حیدر آباد کا معیار تمام ہندوستان سے اونچا تھا۔ اچھے گھرانوں میں مختلف کھانوں کے ماہر کئی کئی باورچی رکھے جاتے تھے۔ اس بارے میں حیدر آبادی بیگمات بھی بہت سلیقہ مند تھیں اور عمدہ کھانے پکانے میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ دستور یہ تھا کہ اگر بیس احباب کھانے میں شریک ہوتے تو صرف دس احباب کو کھانا لانے کی زحمت دی جاتی تھی اور باقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دس اس مرتبہ کچھ نہ لاتے تھے۔ اگلے مہینے میں یہ دس کچھ نہ لاتے اور دوسرے دس احباب کھانا لاتے تھے۔ کھانے کا ایک باقاعدہ مینو تیار ہوتا تھا۔ کلب والوں کو خوب معلوم تھا کہ کس کے گھر میں کونسی چیز خصوصیت سے اچھی پکتی ہے اور وہی چیز اس کے ذمہ ڈالی جاتی تھی۔ خلیفہ صاحب کے ہاں شب دیگ بہت عمدہ پکتی تھی۔ دکنی گھرانوں میں میٹھوں اور حلووں کا معیار بہت اونچا ہوتا تھا۔ مجھے کئی بادشاہوں کے یہاں بھی کھانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بڑے بڑے جہازوں اور یورپ کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں بھی کھانا کھایا ہے لیکن جس معیار کا ایک رکابی ڈنر عثمانیہ کلب میں ہوتا تھا ویسا ڈنر آج تک نصیب نہیں ہوا۔ کھانے کے بعد خلیفہ صاحب سے ہمیشہ شعر سنانے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ اور عموماً یہ محفل ایک مختصر مگر منتخب مشاعرہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

خلیفہ صاحب سے ملاقات سے پہلے مجھے یہ زعم تھا کہ میں بہت پڑھنے والے آدمیوں میں سے ہوں کیونکہ میں اوسطاً سو صفحے روزانہ پڑھتا تھا لیکن میرا مطالعہ زیادہ تر معاشیات تک ہی محدود تھا۔ خلیفہ صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ صبح سویرے اُٹھتے اور ناشتے تک اپنے کمرہ میں مطالعہ کرتے۔ ناشتے کے بعد وہ ایک آرام کرسی پر درخت کے نیچے باغ میں بیٹھ جاتے اور ساڑھے دس بجے تک پڑھتے رہتے۔ پھر یونیورسٹی جانے کا وقت ہو جاتا۔ دوپہر میں آرام کے بعد وہ عصر کے وقت باغ میں آکر پھر اسی کرسی پر ڈٹ جاتے اور مغرب سے ذرا پہلے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پھر کلب چلے جاتے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں گپ شپ رہتی اور پھر سونے سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ ضرور مطالعہ میں صرف کرتے۔ اتوار یا دوسری تعطیلات میں (جو حیدر آباد میں کثرت سے ہوتی تھیں) زیادہ وقت باغ میں آرام کرسی پر ہی پڑھنے میں گذارتے تھے جو ملاقاتی آجاتا وہ بھی پاس کی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ تعطیلات کے زمانے میں پڑھنے کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔ اور ویسے بھی روزانہ اوسط چار یا پانچ گھنٹے سے کم نہ تھا۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی مطالعہ نظر نہیں آتا لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ یہ اوسط سال کے ۳۶۵ دن برابر جاری رہتا تھا خواہ اتوار ہو یا کوئی تہوار اور تعطیلات کے چار مہینوں میں مطالعہ کا وقت بہت بڑھ جاتا تھا تو پھر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس اوسط کی برابری کرنا آسان کام نہیں ہے۔

خلیفہ صاحب نے پڑھنے کے مقابلہ میں لکھا بہت کم ہے۔ حیدر آباد میں قیام تک تو انھوں نے بعض کتابوں کے ترجمے اور چند علمی مقالوں کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا۔ ان کی تمام تر تصانیف پروفیسری سے ریٹائر ہونے کے بعد کی ہیں۔ جب کہ وہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائرکٹر ہو گئے تھے۔ میں حیدر آباد میں برابر لکھتا رہتا تھا اور اکثر ودیشتر ان سے اصلاح مشورہ لیتا تھا۔ وہ میرے مسودات بہت دلچسپی اور توجہ سے پڑھتے تھے اور اکثر میرے قلم کی سختی کو نرم کر دیتے تھے۔ لیکن میں جب کبھی انھیں خود لکھنے پر اصرار کرتا تو وہ نہایت عمدگی سے ٹال دیتے اور کہتے میاں تمہارا مضمون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دال روٹی کا ہے اور تم سبزی ترکاری کے بھاؤ لکھ کر آسانی سے چھوٹ جاتے ہو۔ دراصل ان کی نظر اتنی وسیع اور ان کا اپنا معیار اس قدر بلند تھا کہ وہ کوئی ایسی چیز لکھنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے جو خود ان کے معیار کے مطابق نہ ہو۔

خلیفہ صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کی نظر بہت عمیق تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ان معدودے چند آدمیوں میں سے تھے جو مفکر کہلا سکتے ہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ اس زمانے میں ہندوستان و پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔

۱۹۵۶ء کے شروع میں امریکہ کی انڈیانا یونیورسٹی نے خلیفہ صاحب کو کنووکیشن ایڈریس پڑھنے کی دعوت دی تھی اور امریکہ کے علمی حلقوں میں اس ایڈریس کو بہت اہمیت دی گئی۔ میں ان دنوں واشنگٹن میں مقیم تھا۔ اسی دوران میں انہوں نے امریکہ کا دورہ کیا اور جا بجا لکچر دیئے۔ واپسی پر میرے پاس ٹھہرے اور امریکہ میں حیدرآباد کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں نے امریکہ کے متعلق ان کے تاثرات دریافت کیے تو کہنے لگے ان لوگوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ دوپہر کے کھانے کی دعوت دیتے ہیں اور کھانے کے بعد آرام کی بجائے لکچر دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان داموں پر یہ سودا مہنگا ہے۔ اس لیے میں جلدی واپس آگیا ہوں تاکہ تمہارے ہاں دوپہر کے کھانے کے بعد کم سے کم آرام تو کر سکوں۔

فکرِ اقبال

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

یہ بلند پایہ تصنیف اقبالیات میں گراں قدر اضافہ ہے جس میں حضرت علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کے ہر پہلو کی بڑے دلنشیں انداز میں تشریح کی گئی ہے۔

قیمت ...... دس روپے

ملنے کا پتہ: سیکرٹیری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

© rasailojaraid.com